بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

بنگلہ دیش میں گذشتہ چار پانچ ماہ سے جو ہولناک صورتِ حال پیدا ہو رہی ہے اسے سُن کر ہر حساس انسان سخت مضطرب اور پریشان ہے۔ کوئی صاحب دل تو کسی دشمن کی تکلیف پر بھی مسرت و شادمانی محسوس نہیں کرتا کجا کہ وہ اپنے بھائیوں کے مصائب پر مسرور نظر آئے۔ اس لیے بنگلہ دیش کے مسلمانوں کی تباہی نہ صرف پاکستان کے مسلمانوں بلکہ پوری دنیا کے مسلمانوں کے لیے سخت تشویش کا باعث ہے۔ مگر جذبات کی دنیا سے الگ ہو کر اگر بنگلہ دیش کے حالات پر غور کیا جائے تو اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہاں جو کچھ بھی ہوا ہے وہ بلاشبہ کربناک اور اندوہناک تو ضرور ہے مگر قانونِ قدرت کے عین مطابق ہے۔ اس بدنصیب خطہ کے باشندے اس نوبت تک کسی اتفاقی حادثہ کی وجہ سے نہیں پہنچے، بلکہ ان کے بعض عاقبت نا اندیش رہنماؤں کی بے تدبیریوں، خود غرضیوں اور پیہم حماقتوں نے ان کو اس ناقابلِ بیان مصیبت میں مبتلا کیا ہے۔ ان رہنماؤں کی کوتاہ اندیشیوں کی فہرست اگرچہ اچھی خاصی طویل ہے مگر ان میں چند بڑی نمایاں ہیں، جن کی تباہ کاریوں کا بڑی آسانی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ہم ان صفحات میں ان کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں، کیونکہ ان کی وجہ سے بنگلہ دیش کے مسلمانوں کو ہی نہیں بلکہ پورے عالمِ اسلام کو سخت نقصان پہنچا ہے۔

ان کوتاہیوں اور عاقبت نا اندیشیوں کی نشاندہی کرنے سے پہلے ہم اپنے قارئین کو ان اسباب پر غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں جن کی بنا پر وہ "بنگہ بندھو" جو پانچ سال پیشتر مشرقی پاکستان میں بسنے والوں کی آنکھ کا تارا اور سب سے محبوب رہنما تھا اور جسے وہ نہ صرف اپنا نجات دہندہ سمجھتے تھے بلکہ اس کے اقتدار کو اپنے سارے دکھوں کا مداوا بھی خیال کرتے تھے، اقتدار کے تخت پر متمکن ہونے کے ایک سال بعد ہی اپنی شہرت اور ناموری

کھو بیٹھا اور عوام کے غیظ و غضب کا نشانہ بن گیا۔ اگر ۱۹۷۱ء میں وہ مشرقی پاکستان کے باشندوں کی اُمیدوں کا واحد مرکز، ان کے مصائب اور پریشانیوں کو دُور کرنے کا واحد ذریعہ اور ان پر مسرت و شادمانی کا نور بکھیرنے والا واحد آفتاب تھا تو چند ماہ کی مدّت کے بعد ہی عوام کی نظروں میں سب سے زیادہ معتوب ہو گیا۔ وہاں کے باشندوں کے دلوں میں "اس عظیم نجات دہندہ" کے بارے میں اس قسم کے معاندانہ جذبات پیدا ہو گئے کہ اس آسمان کے نیچے انہیں اس سے بڑا بدخواہ کوئی دوسرا نظر نہ آتا تھا۔ وہ اس کی سربراہی کو خونخوار بھیڑیوں کے تسلط سے زیادہ خوفناک اور تباہ کن سمجھتے تھے۔ انہوں نے یہ بات تو گوارا کر لی کہ وہ اپنی آزادی کو شدّاد اور ہامان جیسے ظالموں اور سفاکوں کے ہاتھ میں رہن رکھ دیں مگر ان کے لیے یہ بات ناقابلِ برداشت تھی کہ جس شخص کو دنیا شیخ مجیب کے نام سے جانتی ہے اس کے ہاتھ میں ان کے ملک کی زمام کار ہو۔ ان کے نزدیک اس کا اقتدار تو ایک طرف رہا، اس کا وجود بھی ان کی دھرتی پر ایک ناروا بوجھ اور نحوست کا سب سے بڑا نشان تھا۔ وہ ساڑھے سال تک "بنگلہ بندھو" کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات پالتے رہے اور بالآخر اس کے خلاف کھلی بغاوت پر آمادہ ہو گئے اور موقع پاتے ہی اس بدنصیب، اس کے خاندان اور اس کے دیگر حاشیہ برداروں کو ٹھکانے لگا دیا۔

کیا اس المناک سانحہ کو بعض سطح بین لوگوں کی طرح محض بنگالی قوم کا جذباتی پن سمجھ کر نظر انداز کر دیا جائے؟ عقل باور نہیں کرتی کہ وہ لوگ جو غیر ملکی سامراج کے خلاف بڑی پامردی کے ساتھ صف آرا رہے ہوں اور جنہوں نے کسی ایک مرحلہ پر بھی باطل کے سامنے جھکنا گوارا نہ کیا ہو اور ملی اور قومی زندگی کے ہر فیصلہ کن مرحلے پر بڑی دانشمندی کا ثبوت دیا ہو انہوں نے یکایک دیوانگی کے عالم میں پاکستان سے الگ ہو کر اپنے آپ کو ہندو سامراج کی تحویل میں دینا پسند کر لیا۔

اگرچہ تلخ حقائق کا اعتراف بڑا صبر آزما کام ہے، مگر اس کے بغیر کوئی چارۂ کار بھی نہیں۔ اگر ہم ان حقائق کے اعتراف سے گریز کریں گے جو فی الحقیقت موجود ہیں مگر ہمارے موافق نہیں تو ہم لامحالہ فریبِ نفس میں مبتلا ہوں گے، جس کا زیادہ تر نقصان خود ہمیں ہی پہنچے گا۔ خود فریبی کا مرض انسان کے اندر اصلاحِ احوال کا ولولہ ختم کر دیتا ہے۔ زیاں خواہ اخلاقی ہو یا روحانی اسی وقت تک انسان کے لیے موجب پریشانی رہتا ہے جب تک اس کا احساس موجود رہے، لیکن اگر یہ احساس مرجائے تو پھر زیاں کی تلافی کی آرزو کسی انسان کے

دل میں کیونکر پیدا ہو سکتی ہے۔

ہمیں یہ بات برملا تسلیم کرلینی چاہیے کہ مشرقی پاکستان کے لوگوں کے دلوں میں اپنی قسمت کے بارے میں جو احساسِ محرومی پیدا ہوا تھا اور جس کے نتیجہ میں ان کے اندر علیحدگی کے رجحان نے پرورش پانا شروع کی اس کے چند ٹھوس وجوہ تھے۔ یہ بات تو کسی حد تک قابلِ قبول ہے کہ اس قسم کے منفی جذبات اُبھارنے میں غیر مُلکی سازشوں کا بھی اچھا خاصا دخل تھا اور اپنے سیاسی مستقبل کو تاریک پا کر مشرقی پاکستان کے باشندوں نے جو انتہائی قدم اُٹھایا وہ بھی بڑا غیر دانشمندانہ تھا، مگر اس حقیقت سے آخر کس طرح انکار کیا جاسکتا ہے کہ مغربی پاکستان میں ملک غلام محمد سے لے کر یحییٰ خان تک جو لوگ بھی مسندِ اقتدار پر قابض رہے انہوں نے مغربی پاکستان کے عوام کی طرح مشرقی پاکستان کے باشندوں سے بھی اسی طرح کا ظالمانہ برتاؤ کیا جس طرح کوئی استعمار پسند طاقت اپنے غلاموں سے کرتی ہے۔ انہیں یہ تو کہا جاتا تھا کہ تم آزاد ہو، مگر آزادی کی سب سے بڑی علامت کہ اقتدار میں سب لوگ شریک ہوں اور امورِ مملکت کو عوام کی مرضی سے چلایا جائے، انہیں کہیں نظر نہ آتی تھی۔ وہ یہ دلفگار سانحہ بار بار اپنی آنکھوں کے سامنے رونما ہوتا دیکھتے کہ محلاتی سازشوں کے ذریعہ حکمران یکے بعد دیگرے ان کی گردنوں پر بالجبر مسلّط کیے جارہے ہیں اور ان کی کہیں شنوائی نہیں ہوتی۔ جو آمر بھی آتا ہے وہ ان کی زندگی کو پہلے سے کہیں زیادہ عذاب بنا کر رکھ دیتا ہے۔ وہ ان کا خون نچوڑتا ہے، انہیں پابندِ سلاسل کرتا ہے، اُن کی زبانوں پر پہرے بٹھاتا ہے، ان کی نقل و حرکت پر ناروا پابندیاں عائد کرتا ہے، الغرض وہ ہر ایسا کام کرتا ہے جس سے انہیں اپنے آزاد ہونے کے بجائے غلام ہونے کا احساس ہو۔ مشرقی پاکستان کے لوگوں کے اندر غلامی اور بے بسی کے اسی ہر آن بڑھتے ہوئے احساس سے فائدہ اُٹھا کر شیخ مجیب الرحمٰن نے چھ نکات کا غلغلہ بلند کیا، جس سے بالآخر مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کے مابین بڑی تلخی کے ساتھ جدائی پیدا ہوئی۔

عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ جب جسم پر کوئی تازہ چوٹ لگے تو جس وقت تک خون گرم رہتا ہے، اس چوٹ کی شدت زیادہ محسوس نہیں ہوتی، لیکن جوں جوں وقت گزرتا ہے، تکلیف بڑھنے لگتی ہے اور پھر اسے اس امر کا احساس ہوتا ہے کہ اسے کوئی حادثہ پیش آیا ہے۔ یہی صورتِ حال مشرقی پاکستان کے باشندوں کو پیش آئی۔ انہیں تو شیخ مجیب نے اس نعرے کے ساتھ مغربی پاکستان سے الگ ہونے پر اُبھارا تھا کہ

اس علیحدگی سے ان کی شبِ تاریک صبحِ اُمید سے بدل جائے گی، انہیں مغربی پاکستان کے استحصال سے نجات حاصل ہو گی، انہیں تقریر و تحریر کی آزادی ہو گی، ان کے اجتماعی اُمور ان کے مفادات کو سامنے رکھتے ہوئے ان کے منشا کے مطابق حل کیے جائیں گے اور اپنے ملک کی زمامِ کار وہ جس کو چاہیں گے اپنی مرضی سے منتخب کر کے تفویض کر دیں گے اور کوئی بیرونی یا اندرونی طاقت ان کی اس راہ میں حائل نہ ہو سکے گی۔

بنگلہ دیش کے رہنے والوں کی یہ آرزوئیں اور تمنائیں بڑی خوش کُن اور دلآویز تھیں۔ جبر کی چکی میں پسنے والے اور استبداد کے زخم خوردہ لوگ اپنی آرزوؤں کی تکمیل کی غرض سے ظلم کے خلاف سربکف ہوتے، مگر افسوس کہ بنگلہ دیش کے باسیوں کی کوئی امید بھی بر نہ آئی اور اُن کا بالکل وہی حشر ہوا جو گمراہ کن نعروں سے مسحور لوگوں کا بالعموم ہوتا ہے۔ جہاں تک مغربی پاکستان کی غلامی سے آزادی اور اس کے استحصال سے نجات پانے کا تعلق تھا، اس کی حقیقت تو بنگلہ دیش کے باشندوں پر اسی وقت کھُل گئی جب "آزادی" کے دو ماہ بعد شیخ مجیب الرحمٰن اور مسز اندرا گاندھی کے مابین یہ بات طے ہوئی کہ "انسانیت نواز" بھارت آئندہ پچیس سال تک بنگلہ دیش کے دفاع کا ذمہ دار ہو گا۔ لہٰذا اس خطہ میں جو فوج بھی متعین کی جائے گی وہ اُس کی مرضی سے ہو گی اور اسے اس امر کا پورا اختیار حاصل ہو گا کہ وہ جس وقت بھی خدشہ محسوس کرے کہ کوئی دوسری طاقت اس نوزائیدہ مملکت کی طرف میلی آنکھ سے دیکھ رہی ہے تو وہ اس ملک کے دفاع کا پورا انتظام اپنے ہاتھ میں لے کر جو کارروائی بھی کرنا چاہے کر لے۔ بنگلہ دیش کے حکمرانوں کا اس میں قطعاً کوئی عمل دخل نہ ہو گا۔ اس کے علاوہ یہ ملک دوسرے ممالک کے ساتھ جو معاہدے بھی کرے گا ان کے لیے پہلے بھارت سے منظوری حاصل کرنا ہو گی کیونکہ اس بات کا خطرہ ہے کہ کہیں یہ "طفلِ نادان" ایسے معاہدے نہ کر بیٹھے جو اس کے مربی و محسن بھارت کے لیے کسی اعتبار سے وجہِ پریشانی ہوں۔ بنگلہ دیش کی معیشت کے بارے میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ وہ بھارتی خواہشات کے تابع ہو گی۔ وہ اپنا سُنہرا دھاگہ صرف بھارتی مہاجنوں کے ہاتھ بیچ سکے گا۔ اور اگر وہ اپنا خام مال کسی دوسرے ملک میں فروخت کرنے کا خواہشمند ہو تو اسے اس سلسلہ میں سب سے پہلے بھارت کی طرف رجوع کرنا ہو گا اور اگر وہ اجازت دے تو پھر وہ کسی دوسرے ملک سے کوئی معاملہ کر سکے گا۔

بنگلہ دیش کے بسنے والے اگرچہ غلط اندیش رہنماؤں کی فریب کاریوں میں آ کر وقتی طور پر ایک ہلاکت خیز قدم

اُٹھا چکے تھے، مگر ان کے دماغ اس حد تک ماؤف نہ ہوئے تھے کہ یہ "آزادی" اپنے جلو میں ان کے لیے جو بربادیاں لائی وہ اسے پہچاننے سے قاصر رہیں۔ انہیں جلد ہی اس بات کا احساس ہوگیا کہ مغربی پاکستان کی غلامی بھی اگرچہ ان کے لیے تکلیف دہ تھی، مگر بھارت کی غلامی اُس غلامی سے کہیں زیادہ ذلت آمیز اور تباہ کُن ہے، اور اگر اس کا طوق کچھ مدت تک ان کے گلے میں پڑا رہا تو اُن کا نام و نشان مٹ جائے گا۔ بھارت نہ صرف ان کے وجود کو دنیا سے یکسر محو کردے گا، بلکہ ان کی معیشت، ان کی معاشرت اور ان کے ذرائع و وسائل پر بھی اس انداز سے قابض ہوگا کہ گویا وہی ان کا حقیقی مالک ہے اور بنگلہ دیش کے رہنے والوں نے اگر کچھ عرصہ تک ان سے کوئی فائدہ اُٹھایا ہے تو یہ ان کا استحصال تھا۔

بنگلہ دیش کے معاملہ میں بھارت کے سفاکانہ طرزِ عمل سے ہٹ کر جب اس ملک کے اپنے "بہی خواہوں" اور آزادی کے قافلہ سالاروں کی سرگرمیاں ذرا کھل کر عوام کے سامنے آئیں تو وہ یہ دیکھ کر سخت مضطرب ہوئے کہ جو شخص کل تک ان کے حقوق کے تحفظ کا دعویدار تھا اور جس نے ان کی حفاظت کے لیے علم بغاوت بلند کیا تھا وہ آج خود بڑی بے دردی کے ساتھ اُن کے انسانی بنیادی حقوق بھی پامال کر رہا ہے۔ یہ شخص جب تک مغربی پاکستان سے وابستہ رہا پارلیمانی جمہوریت کا شیدائی رہا اور گلا پھاڑ پھاڑ کر یہ اعلان کرتا رہا کہ پاکستان کے لیے سیاسی زندگی کا کوئی ڈھانچہ اگر مفید اور کارآمد ہوسکتا ہے تو وہ صرف پارلیمانی جمہوریت ہی ہے۔ اس کے علاوہ ہر سیاسی ہیئت آمریت کا چربہ ہوگی اور اس سے استبداد کو اپنے پنجے گاڑنے کے مواقع فراہم ہوں گے۔ چنانچہ صدر ایوب نے جب ملک میں صدارتی نظام رائج کیا تو یہ شخص بڑے زور و شور سے اس حقیقت کا اعلان کرتا رہا کہ ہمارے اس ملک کے شعوری، معاشرتی اور سیاسی پس منظر میں یہ نظام اندھی بہری آمریت کے مترادف ہے۔ اس لیے اسے جمہوریت کا نام دینا انسانی حقوق سے محروم عوام کے ساتھ ایک شرمناک مذاق ہے۔ جو لوگ ایوب خان کے اس صدارتی نظام کے خلاف آواز بلند کر رہے تھے، ان میں شیخ مجیب بھی پیش پیش تھے اور وہ اس نظام کو پاکستان کے لیے لعنت قرار دیتے تھے۔ مشرقی پاکستان کے عوام کے اندر بھی اس نظام کے بارے میں یہی حقارت آمیز جذبات پائے جاتے تھے اور وہ یہ سوچنے میں بالکل حق بجانب تھے کہ ان کی آزادی کا سب سے بڑا ہیرو اس لعنت سے مشرقی پاکستان کی سرزمین کو ہر حالت میں محفوظ رکھنے کی کوشش کرے گا۔

آپ ذرا دل کی آنکھیں کھول کر ان لوگوں کی محرومی اور تیرہ بختی کا اندازہ لگائیں جن کی سرزمین پہ یہ لعنت خود شیخ مجیب الرحمٰن کے ہاتھوں مسلط ہوئی۔ شیخ صاحب نے یہ کام کسی ترنگ میں آ کر یا ملکی مفاد کی خاطر نہ کیا تھا بلکہ یہ تبدیلی ان ناپاک عزائم کی تکمیل کے لیے بالکل ناگزیر تھی جنہیں وہ پورا کرنے کا عزم رکھتے تھے۔ انہیں اس بات کا شعور تھا کہ ان کی خدائی کا سکہ اسی صورت میں چل سکتا ہے اگر وہ ملک میں یک جماعتی حکومت قائم کریں، کیونکہ یہی وہ واحد راستہ ہے جس سے کسی ملک کے اندر آمریت کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔

یہاں ایک سوال قدرتی طور پر پیدا ہوتا ہے کہ جمہوریت کے اس علمبردار اور انسانی حقوق اور شہری آزادیوں کی حفاظت کے اس دعویدار کو آخر کیا ضرورت لاحق ہوئی کہ اس نے اپنے ملک میں ایک ایسا جابرانہ نظام قائم کرنے کا فیصلہ کیا جس کے خلاف وہ خود کئی سال تک جدوجہد کرتا رہا اور اس کے لیے اسے کئی بار قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑیں؟ اس سوال کا معقول اور مدلل جواب تاریخ کے صفحات میں بڑے واضح انداز اور نمایاں عنوانات کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے کیونکہ اس جرم کا ارتکاب کر کے صرف شیخ مجیب ہی اس حسرتناک انجام کو نہیں پہنچے بلکہ دوسرے بہت سے فرمانروا بھی پہنچے ہیں اور آئندہ بھی جو حکمران آمریت کی راہ پہ گامزن ہوگا اس کا لازمی طور پر یہی حشر ہوگا۔ یہ قوانینِ قدرت کی طرح فطرت کا ایک اٹل فیصلہ ہے۔

کوئی حاکم اور فرمانروا اس وقت تک جادۂ مستقیم پر گامزن رہتا ہے جب تک اسے اس بات کا پورا احساس اور شعور ہوتا ہے کہ وہ بہرحال ایک انسان ہے اور دوسرے انسانوں کی طرح غلطی کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ عقلِ کل بھی نہیں کہ وہ جو کچھ سوچے ہر حال میں صحیح ہی ہو۔ اس کی سوچ غلط بھی ہو سکتی ہے اور اس کے فیصلوں میں کئی قسم کے سقم بھی پائے جا سکتے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ جو شخص اقتدار کے تخت پر متمکن ہو کر اپنے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوا اور اسے اس امر کا پوری طرح احساس ہو کہ وہ منزہ من الخطاء نہیں اور اس سے غلطی سرزد ہو سکتی ہے، وہ لازمی طور پر اپنے آپ کو ان لوگوں کے تعاون کا محتاج پائے گا جو اس کی کوتاہیوں اور خامیوں کو اس کے سامنے بے کم و کاست بیان کر دیں تاکہ وہ اپنی غلطیوں کا ازالہ کر سکے۔ ایسا حکمران اپنے مداحوں کی تعریف و توصیف سے کہیں زیادہ ان حضرات کا قدردان ہوگا جو اسے خوش کن باتیں سنانے کے بجائے عقل کی بات سمجھائیں اور اسے اس کی خامیوں کی طرف متوجہ کریں۔ تنقید کو عام حالات میں بھی خندہ پیشانی کے ساتھ

سُننا کوئی آسان کام نہیں ہوتا کیونکہ یہ وہ چوٹ ہے جو نفس بڑے جبرو اکراہ کے ساتھ ہی برداشت کرتا ہے۔ جب ایک عام انسان کا تنقید کے بارے میں یہ ردّعمل ہو تو کسی حکمران کے ردِّعمل کی شدّت کا بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ آپ روزمرّہ زندگی میں اس بات کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ جس شخص کے پاس تھوڑی سی دولت آجائے وہ اپنے آپ کو اپنے ساتھیوں میں کچھ نمایاں اور ممتاز سمجھنے لگتا ہے اور اس کے اندازِ فکر اور طرزِ تکلّم سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ عقل اور فہم و تدبر کے معاملے میں بھی اپنے آپ کو دوسروں سے برتر سمجھ رہا ہے اور اگر اس کا کوئی رفیق اس سے اختلاف کرے تو اسے یہ بات ناگوار محسوس ہوتی ہے۔

جب ایک درمیانے درجے کا صاحبِ ثروت اپنی ذات کے بارے میں اس قدر حساس ہوتا ہے تو جو شخص سربراہِ مملکت ہو وہ تو اپنی ذات کے متعلق لازمی طور پر انتہائی حساس ہوگا۔ انسانی نفس کی اس کمزوری کا اگر بروقت محاسبہ نہ کیا جائے اور اس کی فتنہ سامانیوں سے بچنے کی طرف پوری توجہ نہ دی جائے تو پھر یہ کمزوری جنون کی صورت اختیار کرکے صاحبِ اقتدار، اس کے وابستگان اور پوری قوم کو تباہی کے راستے پر ڈال دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ جس طرح کائنات کے اندر توازن برقرار رکھتا ہے، اسی طرح اس نے اس بات کا بھی التزام کر رکھا ہے کہ جو فرد اپنی فطری حدود سے تجاوز کرکے کسی شکل میں بھی خدائی کا دعویدار ہو اسے ایسے انجام سے دوچار کیا جائے جس سے وہ دوسروں کے لیے سامانِ عبرت بن جائے۔ چنانچہ جب بھی کوئی حکمران آمرِ مطلق بن کر عوام کی گردنوں پر مسلّط ہوتا ہے، تو وہ درحقیقت انسانوں سے اپنی خدائی منوانے کی کوشش کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے پہلے مرحلے پر یہ سزا دیتا ہے کہ اس سے بردباری اور تحمل کے ساتھ اختلاف کی کوئی آواز سُننے کا حوصلہ سلب کر لیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے گرد بے ضمیر، آبرو باختہ اور بدقماش لوگوں کی بھیڑ جمع ہو جاتی ہے، جن میں سے ہر ایک کی ایک ہی خواہش ہوتی ہے کہ سربراہ مملکت کو ہر جائز و ناجائز طریق سے خوش کرکے زیادہ سے زیادہ دنیوی فوائد حاصل کیے جائیں۔ اس لوٹ کھسوٹ کے عالم میں ملک کی معیشت اور انتظامی مشینری بالکل مفلوج ہو کر رہ جاتی ہے۔ لیکن سربراہِ مملکت کو ہر وقت یہی مژدۂ جانفزا سُنایا جاتا ہے کہ حضور کا اقبال ہر آن ترقی پر ہے اور حضور کی یہ اقبال مندی اگر کسی کی آنکھ میں خار بن کر کھٹکتی ہے تو یہی چند عاقبت نااندیش لوگ ہیں جنہیں آپ سے ذاتی کد ہے، ورنہ ملک کے عوام تو کیا حیوانات و نباتات تک آپ کے حق میں دعاگو ہیں۔ اپنے بارے میں اس قسم کی مبالغہ آمیز مدح و ستائش (باقی اشارات بر صفحہ ۴۲)